© rasailojaraid.com

وحی کی ضرورت

یہ مضمون اڈیٹر برہان کی کتاب "وحی الٰہی" سے ماخوذ ہے، جو عنقریب ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، زیور علم وعقل سے آراستہ کیا۔ اور اس نے انسان کی جسمانی نشو ونما اور اس کی مادی زندگی کی ترقی وفلاح کے لیے کارگاہ ہست وبود کو رنگ رنگ کے نقش ونگار سے سجایا اور ابن آدم کی تربیت وکامرانی کے لیے ایک مخصوص نظام کے ماتحت قطعی اور حتمی وسائل معیشت پیدا کیے۔ چنانچہ وہ پانی پیتا ہے، ہوا میں سانس لیتا ہے، بادلوں سے بارش ہوتی ہے جو اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز وشاداب کردیتی ہے اور جس سے اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ آگ سے وہ اپنی غذا تیار کرتا ہے۔ آفتاب کی دھوپ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں جن کی تخلیق میں انسان کی صنعت وحرفت کو کوئی دخل نہیں، ان پر ہی حیات انسانی کے قیام وبقا کا دار ومدار ہے۔ یہ تمام اشیاء وہ ہیں جن کو مادی زندگی کے قدرتی وسائل وذرائع کہا جاتا ہے، لیکن اس مادی زندگی سے بڑھ کر انسان کی ایک اور زندگی ہے جس کو روحانی اور اخلاقی زندگی کہتے ہیں اور اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ یہ ہی وہ اصل حیات ہے جس پر انسان کی اجتماعی زندگی کا صالح اور درست نظام قائم رہ سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام تمدنی ترقیات عمرانی ایجادات واختراعات، اور عقلی تحقیقات واکتشافات انسانیت کی تعمیر میں مفید ثابت ہونے کے بجائے خود اس کے لیے سم قاتل بنجائیں، اور اس کی سوسائٹیاں وحشیوں اور درندوں کے مہیب ریوڑ کی شکل میں تبدیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو کر رہ جائیں۔ جس طرح پورے نظام شمسی کے قیام وبقا کا دارومدار اجرام فلکی کے باہمی جذب وانجذاب پر ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی سوسائٹی کے نظم ونسق اور اُس کی فلاح ونجاح کا انحصار حاسۂ اخلاقی یا روحانی اعمال وضوابط پر ہے۔[1]

اس بنا پر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رب العلمین جس نے انسان کی مادی وجسمانی زندگی کے قرار وقیام کا خود تکفل کیا۔ اُس کے لیے ایسے قدرتی وسائل وذرائع پیدا کیے جن کی صنعت وتخلیق میں انسان کے اپنے دست ایجاد کو مطلقاً دخل نہیں ہے، وہ ہمیں اخلاقی اور روحانی زندگی کے ایسے قدرتی اصول وآئین نہ بتاتا جو صالح تمدن کے اساس وبنیاد بنیں اور جو قطعی وحتمی ہونے کی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہر شخص کے لیے لائق عمل اور درخور قبول وپذیرائی ہوں۔ اور اُن میں کسی کے لیے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

عقل کی کوتاہی کہا جا سکتا ہے اس طرح کے اصول وضوابط کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خدا کے ہی بنائے ہوئے ہوں۔ اور اُس نے ہی انسان کو اُن کی تلقین کی ہو۔ جس طرح انسان اپنے رہنے کے لیے مکانات بناتا ہے۔ گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے لیے کپڑے بُنتا اور تیار کرتا ہے، اور اسی طرح کی ہزاروں صنعتیں اُس نے اپنے نفع کے لیے ایجاد کر رکھی ہیں وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے لیے اخلاقی ضوابط وقواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کے لیے خود ہی کوئی نسخۂ کیمیا تجویز کر لے۔ عقل جس طرح مادی ترقی کی راہ میں رہنمائی کرتی ہے، اخلاق اور روحانیت کے میدان میں بھی وہ اسی طرح شمع ہدایت بن سکتی اور اُس کا ناخن تدبیر دونوں جگہ مشکل اور پیچیدہ مسائل

[1] ڈاکٹر اقبال مرحوم نے یورپ کی عقلی ترقیات کا اسی بنا پر نہایت بلیغ پیرایہ میں ماتم کیا ہے کہ وہاں ان سب ترقیوں کے باوجود اخلاق وروحانیت کا فقدان ہے اور اس لیے انسانی زندگی کا شیرازۂ اطمینان وسکون حد درجہ پراگندہ وپریشاں ہے فرماتے ہیں:- جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ؛ زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا ؛ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی گرہ کشائی میں کارگر ثابت ہوسکتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی عقل خواہ وہ کتنی ہی کامل ومکمل ہو نقص سے مبرا نہیں ہوسکتی۔ انسان خود اپنی فطرت وطبیعت کے اعتبار سے ناقص وغیر مکمل ہے۔ اس بنا پر اُس کی کوئی قوت بھی، خواہ ظاہری ہو یا باطنی، مادی ہو یا روحانی من کل الوجوہ کامل نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں صحت کے ساتھ خطا، کمال کے ساتھ نقص، اور تذکر کے ساتھ سہو و نسیان کا خدشہ لگا ہوا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، امکان وحدوث کی ظلمت کے ساتھ کمال بے خطا کا نور جمع کس طرح ہوسکتا ہے، جس طرح انسان رنگ اور شکل میں ایک دوسرے سے متبائن ہیں ٹھیک اسی طرح اپنے قوائے فکریہ وباطنیہ کے لحاظ سے بھی وہ مختلف اور ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی خوش نصیب حقیقت کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کرکے صداقت وحقانیت کے چند آبدار موتی حاصل کرلے لیکن اُس کے پاس وہ قوت کہاں ہے جس سے وہ تمام دنیا کو اُس صداقت کا معترف بنا سکے۔ کوئی انسانی اختراع وایجاد خواہ کتنی ہی حقیقت سے قریب ہو اختلاف کی گنجائش سے خالی نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آج تک دنیا کی ممتاز عقلیں بھی کسی ایک مسئلہ پر متفق الرائے نہ ہوسکیں۔ فلسفۂ یونان کے جو بنیادی نظریے تھے۔ اور جو قرنہا قرن تک عالم میں مقبول ورائج رہے۔ آج موجودہ فلسفۂ یورپ نے اُن کو پُرزہ پرزہ کرکے فضا میں منتشر کردیا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آج فلسفۂ حال کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہے مستقبل میں کوئی قوم اپنے جدید نظریات وافکار کی قوت سے اُسے پاش پاش نہیں کردیگی۔ اور اُس عمارت کے کھنڈروں پر ایک نئے نظام فکر وعمل کی دنیا نہیں بسائیگی۔ قرنوں اور صدیوں کے بعد جو کچھ ہوگا اُسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن اتنا تو اب بھی دیکھا جارہا ہے کہ فلسفۂ جدیدہ کی شاندار عمارت کو ارتیاب وشک کا گھن ابھی سے لگنا شروع ہوگیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی استاذ فلسفۂ جدیدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن "فہم انسانی" کے مقدمہ میں اس راز سربستہ کا افشا اس طرح کرتے ہیں:-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل بدل کر کھلے یا چھپے اقرارِ جہل کی تاریخ بن کر رہ گئی، لاک کے یہاں یہ اقرار حسیت کے نقاب میں ہے اور برکلے کے ہاں ادعائے تصوریت کے، مگر اتنی باریک اور شفاف کہ روپوشی سے زیادہ رونمائی کی زینت ہے۔ آخر برکلے کے بعد ہی ڈیوڈ ہیوم نے اس رونما نقاب کو بھی تار تار کر دیا۔ اور نہ صرف جہل وارتیاب کا کھل کر اقرار کیا بلکہ اپنے کو ارتیابی ہی کہلانا پسند کیا۔"

فلاسفہ کا اعترافِ عجز و نارسائی

عقل انسانی کی کوتاہی اور اُس کے عجز وقصور کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ وہ عظیم المرتبت فلاسفۂ عالم جن کے فلسفیانہ افکار و نظریات عقل و فکر کی تاریخ کا آخری نقطۂ عروج مانے جاتے رہے ہیں۔ جب عالمِ حقیقت کی لامحدود وسعتوں میں انہیں قدم قدم پر حیرت وگمشدگی سے سابقہ پڑا تو خود اُنہیں بھی بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ برملا عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف کریں۔ سقراط کا یہ مقولہ حد تواتر تک مشہور ہے "ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے!" انگلستان کا مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم صاف لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ

"انسان ذی عقل مخلوق ہے، اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی عقل وفہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اُس کو وسعت واذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے۔"

"فہم انسانی" ہی میں ایک اور جگہ فلسفہ کا اس طرح مذاق اُڑاتا ہے۔

"مکمل سے مکمل فلسفۂ طبعی بھی صرف یہ کرتا ہے کہ ہمارے جہل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے، جس طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ ہمارے اس جہل کے وسیع حصوں کی پردہ دری کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرار کائنات کی نہیں صرف ہمارے جہل کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے تو انسان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کمزوری اور کوتہ چشمی کا تماشا دیکھنا دکھانا جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود بار بار دوچار ہونا پڑتا ہے“

ہیوم تو خیر ارتیابی تھا، ہر چیز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، مادہ پرستوں کا ابوالآباء دیمقراطیس (متولد ۴۶۰ ق م) تک کا قول ہے کہ کوئی بات سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں۔[1]

پس جب عقل خود ناقص ہے تو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جائیں گے یعنی قیاس، استقرا، اور تمثیل اُن کی نسبت کیونکر بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی صحیح اور یقینی علم کے لیے مشاہدہ سے بڑھ کر کوئی اور قوی دلیل نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ قدیم فلاسفہ میں تو لاادریہ کا ایک مستقل گروہ تھا ہی جو کہا کرتا تھا کہ ہمیں کسی شے کی کوئی حقیقت معلوم نہیں۔ یورپ کے جدید فلاسفہ کی صف میں بھی برکلے جیسے فلسفی نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کسی شے کا وجود صرف وہی ہے جو ذہن میں ہے۔ اس کے علاوہ وجود خارجی کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان فلاسفہ نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے، بلکہ مدعا صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور خدا کی ہدایت اُس کی دستگیری نہ کرے تو خود اُس کی کوششیں بسا اوقات فرطِ حیرت کی ناکامی و مایوسی پر منتہی ہوتی ہیں اور ادراکِ حقیقت کی کسی روشنی تک پہنچنے کے بجائے وہ لاعلمی و نادانی کی تاریکیوں میں خود اپنے آپ کو بھی گم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر اتنی بات اور یاد رکھنی چاہیے کہ جب طبعیات میں عقل کی کوتاہ رسی کا یہ عالم ہے کہ وہ قطعی طور پر کسی چیز کی ذاتیات اور عرضیات میں بھی امتیاز نہیں کر سکتی اور اسی بنا پر ارباب

---

[1] یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اس باب میں جن فلاسفہ کے اقوال نقل کیے گئے ہیں وہ سب ”فہم انسانی“ سے ماخوذ ہیں جو پروفیسر عبدالباری ندوی کے قلم سے ڈیوڈ ہیوم کی کتاب ہیومن انڈرسٹنڈنگ کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ موصوف کی دو اور کتابیں ”برکلے“ اور ”مبادی علم انسانی“ جو برکلے کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں بھی پیش نظر رہی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منطق تسلیم کرتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی حد تام بیان کرنی ناممکن ہے۔ تو ظاہر ہے مابعد الطبیعات میں اُس کی لنگ پائی کا کیا حال ہوگا، اور چونکہ فضائل اخلاق اور روحانی کمالات کا تعلق ایک بڑی حد تک حقائق مابعد الطبیعات کے تصور سے ہے۔ اس لیے عقل اس راہ میں ہماری کامیاب رہنما ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ہم اُس پر اعتماد کلی کر سکتے ہیں۔

عقل اور دل اس مقام پر مزید توضیح و تشریح کی غرض سے اتنا اور یاد رکھیے کہ انسان کو جتنے معاملات پیش آتے ہیں، اُن کا تعلق صرف عقل سے ہوتا ہے یا فقط دل سے۔ اور یا دونوں سے اور یہ واقعہ ہے کہ انسانی زندگی کا قیام و بقا اور اُس کی روحانی و اخلاقی دنیا کا نظم و نسق مبنی ہے اس بات پر کہ انسان عقل اور دل دونوں سے کام لے، کیونکہ جس طرح عقل مصدر شعور و احساس ہے۔ اسی طرح دل جذبات و عواطف کا سرچشمہ ہے۔ اگر ہم عقل (Reason) کے ہی تابع فرمان ہو جائیں اور دل (Feeling) کو ہم پر کوئی دسترس حاصل نہ ہو تو ہم سب اُس فلسفی کی طرح ہو کر رہ جائیں جس کو شادی میں غم۔ اور غم میں شادی کی تصویر نظر آتی ہے اور جو اپنی ہستی کے قطرہ کو وجود ابدی کے بحر ناپید اکنار میں فنا کر دینے کے بعد ہر قسم کے فعل و عمل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم عقل سے بالکل صرف نظر کر لیں اور اپنے تمام معاملات اور افعال و اعمال دل کے میلانات و عواطف کے تابع بنا لیں تو اس کا انجام بھی بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہماری مثال انتہائی عیش پرست اور ظالم و جابر انسان کی سی ہوگی۔ یا پرلے درجہ کے مغلوب الجذبات نرم خو اور دھرا گیں شخص کی سی۔ غرض یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں خیالات و احساسات کا توازن مفقود ہو کر انسانی اجتماعیات کے شیرازہ کو درہم برہم کر کے رکھ دیگا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ دونوں میں ارتباط و التیام ملحوظ رکھا جائے۔ محبت کے عام نفسیاتی قانون کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی طرف نسبتہً زیادہ مائل ہونا چاہیے اس مرحلہ پر ہمارا دعویٰ ہے کہ عقل کو ایک بڑی حد تک "ادب خوردۂ دل" ہونے کی ضرورت ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا ہے عقل محض کی رہنمائی ہمارے لیے کشود کار کا قابل اطمینان ذریعہ نہیں، البتہ وہ عقل جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بقول "ادب خوردگی دل" کے زیور سے آراستہ ہے وہ ہماری روحانی تشنگی کو فرو کرنے کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل ست
نقشے کہ بستہ، ہمہ اوہام باطل ست

ذیل کے شعر میں بھی انہوں نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔

جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے
یا مُردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار

فلسفۂ اشراق جن لوگوں نے تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب مسیحیت اور فلسفۂ محض دونوں انسان کی روحانی تشنگی کے فرو کرنے میں ناکام ثابت ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت عقل کو مطمئن کرنے میں ناکامیاب رہی اور فلسفہ روح اور دل کے لیے کوئی سامان تسکین فراہم نہیں کرسکا تو افلاطون کے متبعین نے فلسفہ اور مذہب دونوں کی آمیزش سے ایک معجونِ مرکب تیار کی جس کا نام فلسفۂ اشراق (Neo-Platonism) رکھا گیا[1]۔ اس فلسفہ کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ طبعیاتی مسائل و مباحث کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور الٰہیات اور روحانیات کے مسائل بھی اس میں شامل تھے۔ فلسفہ کے اس نئے اسکول کا بانی فلاطینس (Plotinus) تھا، جو ۲۰۴ء میں مصر میں پیدا ہوا، اور ۲۷۰ء میں روم میں انتقال کر گیا۔

اسباب و علل خواہ کچھ ہی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فلسفہ کو مشرق میں اور مغرب میں دونوں جگہ بہت فروغ ہوا۔ اور غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایشیا کے دل و دماغ پر تو اس فلسفہ کا اتنا زبردست استیلا ہوا کہ مذہبی عقائد کی مضبوط بنیادیں تک متزلزل ہوگئیں لیکن چونکہ اس فلسفہ کا تمام تار و پود عقل کی موشگافیوں سے ہی تیار ہوا تھا[2]۔ اس لیے معرفت الٰہی حاصل کرنے کے میدان

[1] فلسفۂ اشراق پر مفصل معلومات کے لیے دیکھو۔ Encyclopaedia of Religion and Ethics V. 9, pp: 307-319

[2] اور اگرچہ اس میں ضمیر اکتشنس کی پکار کو بھی دخل تھا، لیکن وہ مغلوب تھی، اور غلبہ عقل ہی کو تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں انہیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ اور یہ رہ نوردان حکمت و دانائی جانفروشانہ تگ و دو کے بعد بھی اُس سرچشمۂ ہدایت تک نہ پہنچ سکے۔ جو روح اور دل کے لیے واحد سرمایۂ تسکین ہو۔

فلسفۂ اشراق خدا کو مانتا ہی نہیں، بلکہ وہ اُس کو تمام کائنات میں جاری و ساری مانتا ہے اُس کے نزدیک خدا منبع خیر ہے، اور مادہ مخزنِ شر و ظلمات، اُس کے اذعان و یقین میں خدا حقیقتِ واحدہ ہے اور انسانی روح اُس کا پرتو۔ اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ اشراق روحانیت، اخلاق تذکیۂ باطن، اور تصفیۂ نفس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے اور انسان کو لذائذ جسمانی ترک کر کے تقوی و طہارت کی زندگی بسر کرنے پر اُبھارتا ہے۔ یہ سب کچھ سہی، لیکن اصل یہ ہے کہ چونکہ اس فلسفہ کی بنیاد کسی خدائی قانون (وحی الٰہی) پر نہیں تھی اور یہ محض عقل کی لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوا تھا اس بنا پر خود خدا کی صفات و ذات کی نسبت اس فلسفہ نے ایسی موشگافیاں کیں کہ اُنھوں نے انسان کی روح کو دلاسا دینے کے بجائے ایسے ایک اور ہولناک ورطۂ حیرت و تذبذب میں پھنسا دیا مثلاً اس فلسفہ نے بتایا کہ ——————

(۱) خدا علۃ العلل ہے۔ اور چونکہ علۃ تامہ سے معلول کا صدور بالاختیار و بالارادہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بالاضطرار ہوتا ہے، اس لیے عالم کی تخلیق بھی خدا سے اضطراراً ہوئی ہے۔ اس میں اُس کی مشیت اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی مثال بالکل آگ کی سی ہے کہ جب وہ پائی جائیگی تو حرارت پیدا ہوگی ہی۔ خواہ آگ کے لیے ارادہ ہو یا نہ ہو۔

(۲) خدا کی ذات اس قدر ارفع و اعلیٰ ہے کہ ہم اُس کی طرف کسی صفت مثلاً علم، ارادہ اور خیر کا بھی انتساب نہیں کر سکتے، حد یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ وجود رکھتا ہے، کیونکہ ہر موجود کا تصور ممکن ہے اور خدا کا تصور ہو ہی نہیں سکتا (لا یُحَدُّ ولا یُتَصَوَّرُ)

(۳) انسان کی روح اگر حسی لذتوں میں مبتلا رہیگی تو وہ قالب بدلتی رہیگی خواہ وہ کسی انسان کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو یا حیوان کا یا نباتات کا۔

غرض یہ ہے کہ اس فلسفہ نے کہیں ادریہ دہ لاادریت کی تلقین کی اورکہیں ویدانت فلسفہ کے دیکھا دیکھی تناسخ کا اقرار کیا، یہ لوگ چلے تھے حق کی تلاش میں لیکن جب عقل محض کی قیادت راہ طلب کی جانگسل صعوبتوں کی حریف نہ بن سکی۔ توانجام کار حضرتِ موسیٰ کی قوم کی طرح خود اپنے وجود کو بھی وادی حیرت میں گم کر کے بیٹھ رہے، ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہ فلسفہ روحانیت اوراخلاق کے چند درچند مواعظ حسنہ کے باوجود تمام دنیا کا تو کیا ذکر ہے کسی ایک انسانی سوسائٹی میں بھی عظیم الشان روحانی واخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس فلسفہ نے انسان کو دماغی بلند پروازیوں میں مشغول کر کے اسے عملی جدوجہد سے محروم کر دیا۔ اوراُس کی عملی قوتوں کو اس درجہ مضمحل بنا دیا کہ وہ تقریبًا ازکار رفتہ ہو کر رہ گئیں مرزا غالب نے شاید اسی قسم کے لوگوں کی نسبت کہا ہے:-

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت   دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

موجبات تسکین یقین عقل منطق، اور فلسفہ ان سب دروازوں سے مایوس لوٹنے کے بعد پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا بتاؤ اطمینان وسکون کا وہ خزانہ کہاں ہے جو انسانیت کی روحانی طلب کو سکون عطا کر سکے؟ قبل اس کے کہ آپ اس کا جواب معلوم کریں یہ جان لینا ضروری ہے کہ یقین کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

کم وبیش تمام علما نفسیات نے یقین کی ماہیت اوراُس کے اسباب وعلل پر بحث کی ہے لیکن نفسی یقین کی کوئی جامع ومانع تعریف نہیں ہے بلکہ اُس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً منطقی یقین (Logical Certainty) نفسیاتی یقین (Psychological Certainty) اور مذہبی یقین (Religions Certainty) اوریقین کا تحقق انہی اقسام میں سے کسی ایک قسم کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضمن میں ہوتا ہے۔ ان اقسام کی تعریفیں جُدا جُدا ہیں لیکن ان سب میں ما بہ الاشتراک یہ ہے کہ یقین ایک طرح کا نفسی میلان ہے۔ جو خاص خاص موثرات خارجی و ذہنی کے زیر اثر انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے[1]۔ اس نفسی میلان کو پیدا کرنے کے لیے نہ فلسفیانہ اور منطقی دلائل کی ضرورت ہے اور نہ ریاضی و اقلیدس کی، بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ میلان نہ علم پر موقوف ہے اور نہ جہل پر، اُس کا انحصار نہ سچ پر ہے اور نہ جھوٹ پر۔ فرض کیجیے ایک ڈاکٹر ہے جسے آپ جانتے ہیں کہ اُس نے اب تک جتنے علاج بھی کیے ہیں اُن میں وہ ناکام رہا ہے۔ اس بنا پر اگر آپ کا کوئی عزیز بیمار ہو جائے تو چونکہ آپ کو اس ڈاکٹر کی نالائقی کا یقین ہے، اس لیے اگر کوئی شخص آپ کو اس ڈاکٹر کے علاج کا مشورہ دیگا بھی تو آپ فوراً انکار کر دینگے۔ لیکن آپ کے برخلاف ایک اور شخص ہے جو کم از کم ڈاکٹر موصوف کے بیس کامیاب علاجوں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے کر چکا ہے، اس لیے اگر آپ اپنے مریض عزیز کے علاج سے متعلق اس شخص سے مشورہ کرینگے تو وہ بے تامل و تردد کہیگا کہ اُسی ڈاکٹر سے رجوع کیجیے، کیونکہ اُسے اپنے ذاتی تجربے و مشاہدہ کے باعث ڈاکٹر کی قابلیت و مہارت فن کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ کو ڈاکٹر کی عدم قابلیت کا۔ اس مثال سے واضح ہوا ہوگا کہ یہاں ڈاکٹر کی قابلیت کی نسبت شخص مذکور الصدر کا نفسی میلان (یقین) اس کے تجربہ پر مبنی ہے۔

اب اس کے بعد اس پر غور کیجیے کہ تجربہ کبھی مسلسل مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے، اور کبھی عمل ذوق و وجدان سے۔ آپ نے اُردو شاعری میں رند بادہ خوار اور زاہد تقویٰ شعار کی نوک جھونک دیکھی ہوگی۔ دیکھیے زاہد شراب کی بُرائی کا یقین رکھتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس رند بادہ آشام کو شراب کی جاں فروزی کا اس درجہ یقین ہے کہ وہ دعوے سے کہتا ہے۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

---

[1] تفصیلی معلومات کے لیے دیکھو: *Encyclopaidia of Religion and Ethics* V. III. p 320-330.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر زاہد اُس کے اس یقین کو توڑنے کے لیے دلائل و براہین پیش کرتا ہے تو وہ اُن کے جواب میں صرف اتنا کہتا ہے :-

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی!

غرض یہ ہے کہ یقین جس کی حقیقت ایک نفسی میلان کے سوا اور کچھ نہیں ہے مختلف جذبات اور قلبی کیفیات کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر کوئی ایک شخص کسی دوسرے کو اس لیے مطعون نہیں کر سکتا کہ وہ کسی چیز کی نسبت اُس کی طرح یقین و اذعان کیوں نہیں رکھتا، ہاں لعن وطعن اور ملامت اگر ہوسکتی ہے تو وہ محض اس بات پر ہوسکتی ہے کہ اُس دوسرے شخص کے دل میں وہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوئی جس کی وجہ سے دل میں اُس چیز کی نسبت نفسی میلان پیدا ہوتا، چنانچہ قرآن مجید نے اُن کفار کے متعلق جو کلمۂ حق قبول نہیں کرتے تھے، یہ نہیں کہا کہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کا یقین کیوں نہیں آتا بلکہ

ختم اللہ علیٰ قلوبہم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوہ — اللہ نے اُن کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مہر لگادی ہے۔ اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

فرماکر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں فطرۃً اتنی صلاحیت واستعداد ہی نہیں کہ ان کے دل میں آنحضرت اور قرآن کی حقانیت وصداقت کے متعلق نفسی میلان پیدا ہو۔

اس تقریر سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یقین بذات خود کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ثمرہ ہوتا ہے ایک خاص طرح کے طبعی وقلبی جذبات وتاثرات کا۔ اب اس مقدمہ کو ذہن نشین کرکے آپ غور کرینگے تو بین طور پر محسوس ہوگا کہ وحی الٰہی انسان کے دل میں جس طرح اطمینان وسکون پیدا کرتی ہے وہ بالکل ایک نفسیاتی طریقہ ہے اور اس لیے انسان اس پیغام ربانی کو سُن کر اس شک وتردد سے دوچار نہیں ہوتا جس کا سبب بالعموم منطقی طرز بحث واستدلال ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثلاً اگر اُس کو یہ بتانا ہے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ خدا کلام کرتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کرتا ہے تو کس طرح؟ کیا اُس کے لیے نطق پایا جا سکتا ہے؟ کیا نطق کے لیے عضلات واعصاب کی ضرورت نہیں ہے؟ جبریلؑ رسول اللہ کے قلب پر کلام خداوندی کا القاء کرتے ہیں تو کس طرح؟ اُس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ جانتا تھا کہ یہ مابعد الطبیعیاتی حقائق ہیں۔ جن کی گرہ کشائی آج تک نہ کسی عقل کے ناخن تدبیر نے کی ہے اور نہ کر سکے۔ جب مشاہدات اور محسوسات کی دنیا میں ہی قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ تو پھر عالم مجردات و معقولات کی وسعتیں کس طرح انسان کی محدود عقل میں سمٹ سمٹا کر جمع ہو سکتی ہیں، اس لیے قرآن نے اس طریقہ بحث و استدلال کو چھوڑ کر ایک بالکل نفسیاتی اور بہت زیادہ موثر طریقہ اختیار کیا۔ اور وہ یہ کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو دنیا کے سامنے پیش کیا، اور دعوت دی کہ آپ کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت و سکون کو نہایت گہری تنقید مگر انصاف اور عدل کی نگاہ سے دیکھو، اسے جانچو، پرکھو، اور بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اس ذات گرامی کو جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟ کیا تمہیں کبھی ان کی کوئی حرکت مشتبہ نظر آئی ہے؟ کیا ان کے کسی فعل و قول پر بھی تمہیں کبھی حرف گیری کا موقع ملا ہے؟ اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو یقین کرو کہ جس ذات نے عمر کا بہترین حصہ (چالیس سال) اس تقویٰ و طہارت، معصومیت، اور فضائل اخلاق کے ساتھ بسر کیے ہیں وہ آج بھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور آج بھی اُس کی زبان حق ترجمان کسی نا ملائم اور نادرست بات سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر پہلی مرتبہ قریش کو عام دعوتِ اسلام دی تو یہی طریقہ اختیار کیا کہ اُن سے پوچھا "بتاؤ تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو؟" جب سب نے بیک آواز اقرار کر لیا کہ "آپ تو امین صادق ہیں، آپ نے آج تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی" تو پھر آپ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن تک اسلام کا پیغام جاں التیام پہنچایا۔ خود قرآن بھی سید کونین کی زبان اقدس سے یوں گویا ہوتا ہے۔

قد لبثت فیکم عمرًا من قبلہ میں نے تو تمہارے درمیان مدت تک عمر گذاری ہے

افلا تعقلون ۔ (یونس) کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وحی الٰہی پیغمبر کو ایک فاضل و کامل معلم۔ یا ایک شفیق و عقلمند باپ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور انسان کے کانشنس یا اُس کے ضمیر و وجدان (Inner feeling) سے اپیل کرتی ہے کہ جس طرح شاگرد وجدانی طور سے اُستاد پر اور بیٹا باپ پر اعتماد کلی رکھتا ہے اور اس لیے اُستاد کی تعلیمات اور باپ کی نصیحتوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تمام دنیا کو پیغمبر کی ذات پر اعتماد رکھنا چاہیے اور اُس کی تعلیمات و ہدایات کو گوش حقیقت نیوش سے سُن کر حرز دل وجاں بنا لینا چاہیے۔

پس یہ ثابت ہو گیا کہ اصل صداقت و حقانیت اور کامل اطمینان و سکون کا سراغ صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ہی مل سکتا ہے، اور انسان کی روحانی تشنگی صرف اسی سرچشمۂ ہدایت کے آبِ زلال سے بجھ سکتی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ "مذہبی دیوانوں" کا کیا ذکر ہے، خود اُن لوگوں نے جو کرۂ فلسفہ کی سب سے اونچی سطح پر نظر آتے ہیں اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

"ہم کو حصول صداقت سے مایوس ہو جانا چاہیے بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس کا علم براہِ راست خود اسی ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے جو اس کا ابدی سرچشمہ ہے۔ یعنی خود خدا کی طرف سے۔ اور یہی وہ آخری حل تھا جو نو فلاطینیوں نے اختیار کیا۔ اور جس کو ارتیابیت نے ناگزیر کر دیا تھا۔ علمی تفکر کی راہ سے حصولِ یقین کی مایوسی ہی اس پر مجبور کر سکتی تھی کہ صداقت کو وحی کے اندر پانے کی کوشش کی جائے جو فکر سے بالا تر ہے۔"[1]

---

[1] جانٹ کی تاریخ مسائل فلسفہ ص ۱۱۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور فلسفی کہتا ہے "انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں، ہاں خدا کے پاس ہے اور مدعی جاہل انسان خدا سے اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح بچہ بڑوں سے"[1] اس جملہ میں "جس طرح بچہ بڑوں سے" کی تشبیہ نہایت بلیغ ہے۔ قائل کی مراد یہ ہے کہ جس طرح بچہ بڑوں سے کوئی بات سیکھتا ہے اور بڑوں کی عظمت و جلالت اور اُن پر کامل اعتماد کی اذعانی کیفیت کے قلب پر مستولی ہونے کی وجہ سے بچہ کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خطرہ نہیں گذرتا کہ بڑوں کا سکھایا ہوا سبق غلط ہوگا۔ اسی طرح انسان جب کسی بات کو اس اذعان کے ساتھ قبول کرتا ہے کہ یہ منجانب اللہ ہے تو اُسے اس وقت کسی تردد و تذبذب سے دوچار ہونا نہیں پڑتا، اور وہ اپنے قلب میں اطمینان و سکون کی ایک جانفروز کیفیت محسوس کرتا ہے۔

ڈیوڈ ہیوم کو سب جانتے ہیں کہ ارتیابی تھا، اور وحی والہام کا بھی منکر تھا لیکن پھر بھی ایک موقع پر سازِ فطرت کے نغمہ کی ایک ہلکی سی آواز اُس کے زبان قلم سے ظاہر ہو ہی گئی لکھتا ہے:۔

"جہاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ان کی اصلی اور محکم بنیاد وحی وایمان پر ہے"[2]

مولانا عبدالباری ندوی نے "فہم انسانی" کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت دلچسپ اور بلیغ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ظواہر عالم کی نسبت ہم سب کچھ جانتے اور جان سکتے ہیں، لیکن حقائق عالم کی نسبت کچھ جاننے کا دعویٰ کریں تو نرا جہل مرکب ہوگا، اور بقول سقراط ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ اس زندگی کو ہم چاہے جتنا سنواریں اور بنائیں لیکن اس کے آگے اور پیچھے کی اگر کچھ فکر ہو تو "اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست" نہ پیچھے کا کچھ نشان ملا، نہ آگے

---

[1] لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ ص ۸۲ [2] فہم انسانی ص ۳۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی کچھ خبر دیسکتے ہیں سوائے اس کے کہ بس بیچ کے اوراق اُلٹ پلٹ کر لال بجھکڑوں کی طرح ہرن کے پاؤں میں چکی کا پاٹ باندھتے رہیے، غرض اپنے یا کائنات کے آغاز و انجام حقیقت و ماہیت، غرض و غایت کے بارہ میں، یہ یا اس طرح کے جتنے سوالات یا انکی تفصیلات ہوں، خالص عقل و استدلال نے ان کے بارے میں کبھی اذعان و اطمینان نہیں بخشا، بلکہ فلسفہ سے انسانیت کی یہ پیاس اپنے حلق میں صرف کانٹوں کا اضافہ کرتی رہی اور جہاں انسانی عقل و فہم نے تجربہ کی راہ سے ذرا بھٹک کر اس خارزار میں اپنے دامن کو الجھایا تو خود فلسفہ کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ طفلانہ ہمت نے دو ہی چار قدم ڈالے تھے کہ شک اور ریب، جہل اور لاعلمی کے کانٹوں نے ہر طرف سے دامن پکڑنا شروع کیا، ایک نکلا نہیں اور دس نے پکڑا، جال کے اندر جتنا پھڑکو وہ اتنا ہی کھال کے اندر گھستا جاتا ہے۔

انسانیت کی بیشتر آبادی ہمیشہ اس وادی میں وحی و ایمان کی رہنمائی کو قبول کرکے چلتی رہی، عقل کو اگر دخل دیا بھی تو زیادہ تر قبول ہی کے لیے، البتہ مغرب جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں بلکہ جہاں ڈوبتا ہے، وہاں کی نئی پرانی دنیا دونوں کو وحی و ایمان سے کچھ قدرۃً بُعد رہا ہے۔ تو اس کے فلسفہ کی نئی پرانی دونوں تاریخوں کی جو کم و بیش ڈھائی ہزار سال کی وسعت میں پھیلی ہیں، ورق گردانی کر جاؤ، جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی دانش کی جگہ نادانی اور علم کی جگہ لاعلمی سے دوچار ہوتے جاؤ گے"

(دیباچہ فہم انسانی)

اس حقیقت کو ایک اور مثال سے سمجھیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام مشاہدات کا تعلق بینائی سے ہے۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ مشاہدہ کا انحصار صرف قوتِ بصارت کے صحیح و سالم ہونے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر ہے؟ ہرگز نہیں۔ بصارت کے ساتھ ساتھ خارجی روشنی کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ بینائی کی۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی تیز ہو لیکن اگر کوئی خارجی روشنی نہ ہو، آفتاب کی ہو، یا کسی لیمپ یا بجلی کی، اور تمام فضا تاریک ہو۔ تو ظاہر ہے کہ یہ تیز نظری کسی کام کی ثابت نہ ہوگی۔ بس اسی طرح عقل میں قدرت کی طرف سے جو قوت بصیرت ودیعت رکھی گئی ہے وہ اپنی جگہ مسلم اور درست۔ لیکن جس طرح بصارت بغیر خارجی روشنی کے محض بیکار ہے، اسی طرح عقل کی روشنی صرف اُسی وقت کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ خارج میں بھی اُس کی رہنمائی کے لیے کوئی قوی روشنی موجود ہو اور یہ روشنی وہی ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں "وحی" کہتے ہیں۔ آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

هو الذی یُصلّی علیکم و ملٰئکتہٗ — وہ (خدا) وہی ہے جو خود اور اُس کے فرشتے تم پر رحمت
لیخرجکم من الظلمٰت الی النور ط — بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف
وکان بالمؤمنین رحیمًا۔ (الاحزاب) — لے آئے اور اللہ مومنوں پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔

بصارت اور بصیرت میں صرف ظاہر و باطن کا فرق ہے، ورنہ دونوں کا حال افادہ کے اعتبار سے بالکل یکساں ہے۔ جس طرح آفتاب ساوی کے بغیر بصارت ناکارہ ہے ٹھیک اُسی طرح عقل و خرد کی بصیرت خورشید حقیقت کی جلوہ پاشیوں کے بغیر۔ اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باوجود قطعاً بے فائدہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس روشنی کے بغیر ہی محض عقل کے سہارے چلنا چاہتا ہے تو وہ اُس بیوقوف سے کسی طرح کم درجہ کا احمق نہیں ہے جو شدید تاریکی میں بھی اپنی آنکھوں پر اعتماد کر کے سرپٹ دوڑنا چاہتا ہے۔

اقبال نے کیا خوب کہا ہے:۔

انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوق عمل کے واسطے موت
دل در سخن محمدی بند — اے پور علی ز بو علی[1] چند

[1] مشہور مسلمان فلسفی شیخ ابو علی بن سینا۔

© rasailojaraid.com